ادب شعر اردو

پنڈت رتن ناتھ سرشار کی اوّلین تصنیف

تقریظ

قندیلِ حرم

انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز رامپور

RekhtaDownload.com

پنڈت رتن ناتھ سرشار کی اوّلین تصنیف

تقریظ قندیلِ حرم

مرتبہ

مسرت حسین آزاد
عابد رضا بیدار

انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز رامپور

RekhtaDownload.com

ناشر

انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز رامپور۔یوپی

طابع : جمال پرنٹنگ پریس، دہلی

سال تصنیف : ۱۸۷۳ء

سال اشاعت : ۱۹۶۷ء

قیمت : پانچ روپے

کتبہ : وجیہ اللہ رامپور

RekhtaDownload.com

وارث ہاشمی کے نام

RekhtaDownload.com

تقریب

قندیل حرم نواب کلب علیخاں والیٔ رام پور (۱۸۶۵ء ــــ ۱۸۸۷ء) کی فارسی تصنیف ہے جو ۲۶×۲۰/۴ سائز میں مطبوعہ ۱۳ صفحوں میں آئی ہے جس پر امیر مینائی نے فارسی ہی میں، صفحے کی تقریظ لکھی ہے جو کتاب میں شامل ہو کے چھپی ہے۔ سالِ اشاعت ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء ہے اور مطبع "مطبع حسینی ملقب بہ رئیس المطابع" رامپور۔ کتاب کے پہلے صفحے کی عبارت، نمونتہً، درج ذیل ہے:

"نرہے آفرید گار بیچگوں، و اور داد ار رہنموں؛ طرازندۂ چرخ ترسی، فرازندۂ عرش و کرسی؛ مصنفِ شموع علوم، ناظم لآلی نجوم؛ آرایشگر مطلع الجیب حوریاں ہمہ غنج و دلال، نگارندۂ دو پوستہ، دو رنگ زبان جادو مقال؛ دلبری آموز ابروئے مقوس خونخوار، طغری نویس منشورِ حسن پر پرنگ طرہ طرار ......"

یہ نثر رنگین جج بیت اللہ کی تقریب پر لکھی گئی جو فروری ۱۸۷۳ء کو ادا ہوا۔ سرشار نے اسی نثر پر تقریظ لکھی ہے جس کا واحد نسخہ (غالباً بخط مصنف) رضا لائبریری میں محفوظ ہے کتاب کی کوئی خاص اہمیت نہیں، اہم بات یہ ہے کہ سرشار نے اردو میں اس فارسی کتاب پر تقریظ لکھی ہے، جو بہ ظاہر کتاب کے سالِ اشاعت ۱۸۷۳ء کے قریب ہی کی تصنیف ہونی چاہیے۔ اب تک ہمیں سرشار کی اولین تصنیف "شمس الضحیٰ" معلوم تھی جو ۱۸۷۸ء میں شایع ہوئی۔ اب اس تحریر کی دریافت سے تاریخ تقریباً ۵ سال پیچھے پہنچ جاتی ہے۔

ر اولیت کا شرف اِسے مل جاتا ہے۔ سرشار کی اس تصنیف کی ایک اہمیت تو یہ ہے۔ اور دوسری یہ کہ
اس میں آپ کو بول چال کی زبان، سلیس اور رواں دواں بنیادی نثر لکھنے والے سرشار کے بجائے بالکل
دوسرا مصنف نظر آئے گا، جس پر رجب علی بیگ سرورؔ صاحبِ "فسانۂ عجائب" کا دھوکہ ہوتا ہے۔ اسے
فسانۂ عجائب" کا فیضان کہیے یا اس عہد کا عام رنگ ـــ یا پھر اس کتاب کے انداز کی پیروی جس کی تقریظ
لکھی جا رہی تھی؛ بہرِصورت اتنا تو طے ہے کہ یہ سرشار کے عام رنگ کے بالکل برخلاف اس مسجع و مقفع نثرِ
رنگین کا نمونہ ہے جو سرشار کے اپنے خاص رنگ کی عین ضد ہے۔ امید ہے اس لحاظ سے بھی اسے دلچسپی سے
پڑھا جائے گا۔

متن میں جا بجا جو شعر استعمال ہوئے ہیں اور جن کی تخریج کی کوئی باضابطہ کوشش نہیں کی جا رہی ہے، ان کے سلسلے میں چند اشارے فائدے سے خالی نہ ہوں گے:

سرشار خود بھی شاعر تھے امیرؔ کے شاگرد تھے اور نثر نگاروں جیسی شاعری کر لیتے تھے۔ جو پھیکے سادے سپاٹ شعر، خصوصاً موقع کی مناسبت سے لائے گئے شعر، اس متن موجود ہیں وہ غالباً ان کے اپنے کہے ہوئے ہی ہوں گے۔

(ص ۹، ۱۲، ۱۷، ۲۱، ۲۳)

فارسی کے بعض مشہور منفرد اشعار اور مصرعوں کے علاوہ (ص ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۳، ۲۴) جو اکثر قارئین کی نظر میں ہوں گے، مثنوی کی معروف بحر میں جا بجا جو شعر موجود ہیں وہ بھی شاہنامہ، بوستاں، سکندر نامہ یا انہیں کے قبیل کی کسی اور کلاسیک میں تلاش سے مل جائیں گے (ص ۱۰، ۱۱، ۱۴)

اردو اشعار ذوق و غالب کے قصیدوں اور مثنوی گلزارِ نسیم سے ماخوذ ہیں (ص ۱۱-۱۲، ۱۹-۲۰، ۲۴؛ ۱۲) ـــ
ـــ دوہا (ص ۱۹) بہاری یا اسی کے اسکول کے کسی شاعر کا ہوگا۔

مرتّبین

RekhtaDownload.com

متن

RekhtaDownload.com

مانگتا ہوں اِس عریضے کا صلہ
دو کر سے کچھ نہ مانگوں عمر بھر

تقریظ

کتاب قندیلِ حرم

رقم زدہ

فدوی داعی دولت

پنڈت رتن ناتھ لکھنوی

ماسٹر گورنمنٹ اسکول لکھیم پور، اودھ

RekhtaDownload.com

یا فتاح

السخی حبیب اللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رب یسر   وتمم بالخیر

ثنا ہا ہمہ ایزد پاک را
ثریا دہ طارم تاک را

امّا بعد

مشاطگان عرائس روایات رنگین، ونگار بندانِ عوانس حکایاتِ دلنشیں نے اغابید دلربائے معانی اور احتام کج ادائی نکتہ دانی کو یوں جلوہ پرداز بیان کیا ہے؛ اور شہسوارانِ مضمار خوش بیانی، و یکہ تازان میدان سحر بیانی نے اشہب آہو شکار و تیز رفتار خامہ کو صفحۂ قرطاس فصاحت اساس پر اس طرح جولان دیا ہے کہ ایک روز سعید بہتر از عید، ذرّۂ بے مقدار، خاکسار عبودیت شعار، خاکپائے فصحائے نامی، ابجد خوانِ داستانِ خوش کلامی، ہیچمیرز، ہیچمداں، ژولیدہ زباں، کج مج بیاں، پنڈت رتن ناتھ لکھنوی، ماسٹر مدرسۂ عالیہ لکھیم پور ضلع کھیری، ملک اودھ، غریب خانۂ عجز کاشانہ پر بیٹھا تھا؛ خواقین ثریا جاہ وسلاطینِ عرشِ کلاہ کے[1] سوانح عمری چشم بصیرت سے دیکھتا تھا؛ کسی فرمان فرمائے ذی شان کے حالِ خجستہ فال پر احسنت و مرحبا کہتا تھا، اور کسی ظالم اظلم کے افعالِ ناشایستہ اور حرکاتِ

---

[1] اصل: کا

ناشایستہ پر لاحول پڑھتا تھا۔ محمد جلال الدین بادشاہ جم جاہ کا عروج اقبال، سلطنت مغلیہ کا زوال، محمود غزنوی کی جنگ و جدال، مصاف پانی پت کرنال، پرتگالیوں اور فرانسیسیوں کے قیل وقال، تنازع ممالک دکن و بنگال، صوبہ اڑیسہ کا کال، حضرت قدر قدرت ملکہ معظمہ کا جاہ و جلال، سیواجی اور اورنگ زیب کا باہمی ملال، لارڈ میو کا انتقال ؛ غرضکہ خیالات گوناگوں نے دل میں جگہ پائی تھی اور یہی دھن سمائی تھی کہ شاہان خلف و سلف میں کس نے کیا کارنمایاں کیے اور ارا کین سلطنت ماضیہ و حال میں سے کس نے کار متعلقہ بحسن و خوبی انجام دیے۔ جب کبھی کسی تاجدار نصفت شعار یا کسی حاکم نا مدار رعایا کے یار غمگسار کا عدل یاد آتا تھا، غنچۂ دل نسیم مسرت کے اہتزاز اور بادِ طرب انگیز کے ہبوب سے کھل جاتا تھا۔ اور جب کبھی کسی ظالم اظلم کے جور و ستم کی طرف خیال جاتا تھا، کلیجہ منھ کو آتا تھا۔ یہ سب باتیں میں سوچ ہی رہا تھا کہ وقت شام ہوا، دن قریب اختتام ہوا، آفتاب لبِ بام ہوا۔ مویشی مرغزار پُر بہار سے آہستہ آہستہ بستی کی طرف آنے لگے۔ کسان بیچارے دن بھر کے تھکے ماندے، مرے پٹے، اپنی اپنی جھونپڑیوں کو جانے لگے۔ اشعار:[1]

چو خورشید گشت از رواق بلند — زمانہ بپوشید مشکیں پرند
جہاں شد چو زنگیِ قطراں فروش — دو و دام از وحشت شبِ خموش
درخشاں دراں شب سہیل یمن — چو رائے صواب از دلِ اہرمن
شب تیرہ گوں بود گفتی غراب — ہمہ چینۂ او زرِ خوشاب

عائل روزنے، بڑی شوکت و شان و آن بان سے، بحر الکاہل کی سمت اشہب خوشخرام و تیز گام عزیمت کو سبک عناں کیا ؛ اور خاتون شب نے جسکے جلو میں کروروں سہیلیاں نازنیں زہرہ جبیں رشکِ لعبتان چیں تھیں، روزگار سپہر کو زیب و تجمل بخشا۔ اشعار:[2]

شب کو میں اپنے سرِ بسترِ خوابِ راحت — نشۂ علم میں سرمست غرورِ نخوت
مزے لیتا تھا پڑا، علم و عمل کے اپنے — تھا تصور مرا ہر چیز میں تصدیق صفت

---

[1] اصل: کے لہ یہ ذوق کا قصیدہ ہے۔ دوسرے شعر میں ذوق کے یہاں "مرا ہر امر میں" ہے اور تیسرے شعر کے دوسرے مصرعہ میں "تجربہ کی" ہے۔

جو مسائلِ نظری تھے وہ بدیہی تھے تمام ‏ عقل کو تجربہ سے اتنی ہوئی تھی کثرت
کبھی میں کرتا تھا اعراض میں جوہر قائم ‏ کبھی میں کرتا تھا معلول سے ثابت علّت
کبھی کرتا تھا عروضی کا کبھی میں قافیہ تنگ ‏ طبعِ موزوں کی دکھاتا تھا جو موزونیت

کہ دفعۃً خوابِ شکر فیروزی اثر مجھ پر تاخت لایا، اور طرفۃ العین میں مجھ پر غالب آیا، تو کیا دیکھتا ہوں کہ کف دشت میدان میں کھڑا ہوں، اکیلا پڑا ہوں۔ آفتاب عالمتاب کی شعاع زرنگار سے جو اشیا نظر آتی ہیں وہ شبِ دیجور کی تاریکی کے سبب دھندلی دکھائی دیتی ہیں۔ چو طرفہ سنسان بیابان، ہُو کا عالم، نہ چرند نہ پرند نہ آدم ؎

سائے کو پتا نہ تھا شجر کا ‏ عنقا تھا نام جانور کا[1]
مرغانِ ہوا تھے ہوش رباہی ‏ نقشِ کفِ پا تھے ریگِ ماہی

ہر سمت سناٹا پڑا ہے۔ کہیں پرندہ پر نہیں مارتا ہے۔ اس وقت دل کا عجیب حال تھا، کبھی حیرت تھی کبھی ملال تھا۔ تھوڑی دیر میں چاندنی نے سبزے میں کھیت کیا، چاندنے سبزانِ گلابی پوش کی طرح ہالۂ زرنگار سے مکھڑا دکھایا۔ رات بھر ادھر اُدھر پھرا کیا۔ راستہ ڈھونڈا کیا۔ حسرت تھی کہ الٰہی یہ کیا اسرار ہے؟ یہ صحرائے پُرخار ہے یا گلزار سراپا بہار ہے؟ غرضکہ عرصہ تک بھٹکتا پھرتا تھا اور یہی سوچ رہا تھا کہ جاؤں تو کدھر جاؤں اور رہوں تو کہاں رہوں؟ چلتے چلتے کیا دیکھتا ہوں کہ ایک چمنستان بے خزاں ہے جو رشکِ باغِ جناں ہے

ابیات:

گل ہیں سب اپنے اپنے جوبن پر ‏ بوئے گل ہے صبا کے توسن پر!
ہے عجب لطف ہر شگوفۂ گل ‏ باغ رنگین جس سے ہے بالکل
ہے عجب لطف ہر جمال چمن ‏ جھومتے ہیں کھڑے نہال چمن
سبزہ اک جا پہ لہلہاتا ہے ‏ پیچ سنبل کہیں پہ کھاتا ہے
چار جانب سے آتی ہے خوشبو ‏ کہیں جُوہی کھلی کہیں شبّو

---

[1] یہ دونوں شعر سرشار نے گلزار نسیم سے لیے ہیں۔

انواع و اقسام کے درخت اس میں لگے ہیں اور طرح طرح کے پھول کھلے ہیں۔ اشجار لطافت بار ایسے رفیع و بلند کہ گویا آسمان سے باتیں کرتے ہیں، خوبی و خوش اسلوبی میں طوبیٰ کو شرماتے ہیں، ان پر رنگ رنگ کے خوشنما طیور بسیرا لیتے ہیں۔ کسی سمت طاؤس طنّاز باہزاراں کرشمہ و نازفرطِ ابتہاج سے رقص کرتا تھا اور نیرنگیٔ قدرت حق کا تماشا دکھاتا تھا۔ کسی سرسبز درخت پر طوطیِ زمردیں لباس مثل حلّہ پوشانِ بہشت مصروف یادِ الٰہی، اور شجر پر ثمر پر ہزار داستان عشقِ معبودِ حقیقی سے جوش میں آکر منقار ہزار زباں سے مشغول نغمہ سرائی۔ قمری کو کو زبان حمدِ خالق زمین و زماں میں بہ نالۂ حق سرہ رطب اللسان، عندلیب نالاں کو وظیفۂ گل نوکِ زبان، لبِ جُو بگلوں کی قطار، کہیں ہزار داستاں کا نغمۂ دلفگار، طوطیاں زمردیں لباس کا پرواز، مینا کے پروں پر میناکاری کا انداز۔ کویل کا آم کی کونپل پر بیٹھنا اور اپنی پیاری آواز سے لبھانا۔ چکور کو معشوقِ حقیقی کے عشق میں نعل در آتش پایا، کوکلا کو گلا کیا نورانی خدا نے عطا فرمایا۔ کہیں سبز کی خجستہ فال، کہیں کبک کی مستانہ چال۔ پپیہوں کی پکار، موریلوں کی سریلی جھنکار۔ کسی کونے میں مرغ زریں تاجداران ذوی الاقتدار کی طرح تاج خسروی زیب سر کیے شوکت و شان سے پھرتا ہے، کسی گوشے میں کرم شب تاب اپنے معشوق کو ڈھونڈتا ہے۔ شکر خورے کی زبان ہے کہ خوزستان ہے، یا قند و نبات کی کان ہے۔ تذرو کے قہقہے، بلبل کے چہچہے، پھولوں کی بوباس، کہیں گل مہندی، کہیں گل عباس۔ سبزۂ چمن کا جوبن، جوانانِ گلشن کی پھبن۔ مرغانِ خوش نوا نے باغبانی کا پیشہ اختیار کیا، نغمے کے برگ و بار کو آب ترنم سے تر او نم کر دیا۔ شبّو شبّو ر بجا رہی ہے، نیا و فر آفتابی مہتاب کو شرما رہی ہے۔ سوسن کے عکس سے آسمان نیلگوں ہو گیا۔ گلِ داؤدی پر نغمہ سنجان چمن نے لحن داؤدی شروع کیا۔ گل فرنگ، نہایت خوش رنگ۔ موتی میں موتیا کی سی آب و رنگ کہاں پایئے، دلجوئیِ عشاق کے لئے جوہی کا پھول یہاں سے لیجایئے۔ چاندنی نے گل چاندنی سے صباحت کا نقشہ اڑا لیا۔ سورج مکھی سے آفتاب نے جو آنکھ لڑانے کا دعویٰ کیا تو خیرگی نگاہ سے

شرما کر بحرِ ظلمات میں ڈوب مرا۔ کلغی کا تختہ ہے یا گل لالہ کھلا ہے۔ گلاب کو دیکھ کر اچھے اچھے گلفام آب آب ہو جاویں، بیلے سے البیلے جوانِ نوخاستہ بے تاب ہو جاویں۔ شفتالوئے کاروی کچھ سُرخ، کچھ سبز، قوت راح، خوش ذائقہ و نغز۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی معشوق ملیح گلابی پوش ہے، ڈال ڈال پر مرغانِ خوش الحان کا جوش و خروش ہے۔ گل لالہ کی تعریف میں زبانِ ناطقہ لال، لالۂ دلسوز و خودرو سے تختے کا تختہ مالا مال۔ کہیں خطائی کہیں نغمانی، کہیں کوہی، کہیں صحرائی۔ سیب بیغائلہ ریب دافع آسیب، مقوی ہر شیخ و شیب۔ لال لال نارنگیوں کا عکس جو چشمہ سار میں پڑتا تھا تو گویا پانی میں سرو چراغاں کا لطف آتا تھا۔ اس باغ میں باغبان نے اجتماع ضدین اور محالات کو ممکن کر دکھایا، پانی کی تہ میں آگ کا شعلہ بھڑکایا۔ نیشکر کے پور پور پر شیرینی شکر خورے کی صورت بن کر بھاندی پڑتی ہے، ہر دین انگور کے گچھے لیے بھاگنے کی تاک جھانک میں رہتی ہے۔ کہیں پھلیندا کہیں جامن، کہیں سیر نازک بدن۔ انار کی شہابی رنگت پر چنار جل مرا، اور یاقوت نے مارے غیرت کے کوہ بدخشاں پر سر ٹپک مارا۔ کولا سب میووں سے اولیٰ۔ شکر قند، دلپسند۔ کھجور، دل کا سرور۔ آم، مرغوب خاص و عام۔ بہی مقوی دماغ، شفتالو زینت باغ۔ کٹھل بہت ہی مرغوب، بڑھل سب کو مرغوب۔ نارنگی گول، خوش رنگ انمول۔ اشعار:

بہ سیبش صبا بر نیفشاندہ گرد	یکے نیمہ سُرخ و یکے نیمہ زرد
تو گفتی کہ گل چہر گانِ فرنگ	فگندہ بہ سر چادرِ زرد رنگ
مرو دش شدہ راحِ دل قوتِ روح	چو مریم کہ آبستن آید بہ روح
لب پستہ اش با شکر خندہ بود	شکر بستہ اش راجاں بندہ بود
شدہ نخلِ عناب چوں نخل طور	بہ بہندہ آتش نمودے ز دور
گہے سبزہ فرشم شدے در چمن	گہے خیمہ بر سر زدے نارون

کہیں حوض کہیں رودبار، کہیں فوّارے، کہیں چشمہ سار۔ کہیں آبِ رواں،

کہیں دریا رشکِ عماں۔ یہ سب لطیف و نظیف چیزیں دیکھتے ہوئے میں آہستہ آہستہ قدم دھرتا تھا، مگر ہر قدم پر نظر کا قدم پھسلتا تھا۔ چلتے چلتے کیا دیکھتا ہوں کہ نازنین پری پیکر رشکِ قمر ہر ایک، ان میں سے کم عمر؛ چودہ چودہ برس کا سن، الھڑپن کے دن؛ بادہ شباب میں مخمور، جوانی کے نشے میں چور؛ مطلق العنانی اور آزادی سے چوطرفہ گھوم رہی ہیں، جوانی کی مستی سے جھوم رہی ہیں۔ ہر ایک کے انوکھے چونچلے نئے انداز، کبھی کرشمہ کبھی ناز۔ کوئی برابر والی سے دل لگی کرتی ہے، کوئی پھبتی کستی ہے۔ کوئی ہمجولیوں سے ٹھٹول کرتی ہے، کوئی چھماں چھماں چمن میں پھرتی ہے۔ اپنی رسیلی اور کٹیلی نگاہ سے انھوں نے ایسے بھالے مارے کہ بے اختیار یہ اشعار حسرت یار میں نے زبان سے نکالے:

اے بحرِ لطافت و نکوئی — تا چند زمن کنارہ جوئی
لب تشنۂ شربت وصالم — سیرابیم از چہ رو نجوئی
بسیار طریق مہربانی — اے ماہ مناز ل نکوئی
چوں دل نہ بری ز بلبل و گل — پاکیزہ جمال و خوش گلوئی

پھر، جو ایک قصر بلوریں نظر آیا تو آنکھوں نے عجب نور پایا۔ صحن اس کا صفائی میں قمر سے زیادہ خوش نما، اور معشوقوں کی ساق سیمیں سے کہیں مصفّا۔ اس کو بہشت بریں سے نسبت دینا بجا ہے اور ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است — ہمین است و ہمین است و ہمین است

کہنا روا ہے۔ خورشید گیتی فروز دن بھر اس میں جاروب کشی کرتا ہے، شام سے مہتاب یہ خدمت اپنے ذمے لیتا ہے۔ اشیاء بیش بہا لاتعد و غیر محدود، تمام عالم کی نعمت اس میں موجود۔ جی تو چاہتا تھا کہ اندر جاؤں مگر ڈر تھا کہ کہیں زک نہ اٹھاؤں ؎

تنگ آیا تھا نہایت خاطر مشتاق سے — ہر گھڑی کہتی تھی چل، ہر وقت سمجھاتی تھی ہاں

خیر ؏ — "ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم"

کہتا ہوا اندر گیا۔ نظر کے قدموں سے گلگشت کرنے لگا۔

چشمِ زدن میں ایک تخت زمردیں نظر آیا، جس کے حسد سے زمرد نے ہیرا کھایا۔ اس پر نازنینانِ زہرہ جبیں، رو کش لعبتانِ چیں، بصد دلربائی متمکن ہیں۔ اس غنچے میں ایک پریزاد، سہی بالا، رشکِ شمشاد، نظر پڑی؛ اور آنکھیں، چشم بد دور، بادۂ عشق سے مخمور، سرمستِ خوبی محوِ ناز، ایک ایک اشارے میں لاکھ لاکھ انداز؛ ابرو شمشیر بُراں بلکہ تیغ اصفہان، ہلالِ آسماں یا فتنۂ دوراں؛ مکھڑا ایسا جیسے چاند، بلکہ چودھویں کا چاند بھی اس کے آگے ماند؛ رخسار گلِ تر، بلکہ رشکِ قمر۔ توبہ توبہ، میں نے یہ کیا غلطی کی کہ کیسی بھونڈی تشبیہہ دی۔ گل کے ساتھ تو خار ہوتا ہے، قمر داغدار ہوتا ہے۔ گل چند روزہ پائدار کہاں! قمر کے گیسوئے تابدار کہاں!! گل پر تو صرف بلبل کا دل لوٹ ہے، اس کے رخساروں سے تمام عالم کے دل پر چوٹ ہے۔ صاحبِ آیۂ وَالشَّمْسِ وَاللَّیْلِ رخ اور گیسو ہے؛ رخ انور نور کا گھر، جعد مشکیں عنبر سے کہیں زیادہ خوش بو ہے۔ چوٹی جوایڑی تک لٹکتی تھی تو کمر ہزار جگہ سے لچکتی تھی۔ منھ بے نشاں، نقطۂ موہوم وہاں ؎

ہست ہیچ آں کمر دگر معلوم	کردم از دقت نظر معلوم
آں دہن چیست نقطۂ موہوم	بے تامل شد ایں قدر معلوم

چاہِ زنخداں وہ کہ یوسف کو کنوئیں میں جھنکائے، زلیخا کا دل اس کی چاہ میں ڈانواں ڈول ہو جاوے۔ ملاحت کا یہ عالم کہ اگر شراب کو ہاتھ لگائے فی الفور سرکہ تند ہو جائے۔ صباحت کی جان، خوبی کی کان۔ یہ لبِ شیریں پر خال ہے یا چشمۂ کوثر پر بلالؓ ہے۔ اشعار:

بہ قامت صنوبر بہ چہر آفتاب	دو ہندو بہ یغما دو جادو بہ خواب
بہ گردن دو گیسویش از مشک ناب	کمند افگنِ گردنِ آفتاب
نگاریں کفش چوں بہ ساغر گلاب	عیاں کردہ بس ماہ نوز آفتاب
مگر گشتہ دیوانہ روئے خویش	کہ زنجیر خود کردہ گیسوئے خویش

اس نگارِ ارمنی کے دستِ نگارین کی حنا لعل و یاقوت کو خون رُلاتی ہے، مرجاں کو شرماتی ہے۔ ساق بلوریں پر زلیخا کی نظر پھسل جائے، بھلا کاشانی مخمل اس کے آگے کیا وقعت پائے۔ غرضکہ جب سے ایزدِ پاک نے لفظِ کُن سے دُنیا کو نمودار کیا، اور مافیہا کو آشکار؛ ویسی پری پیکر رشکِ قمر؛ حورانِ بہشتی کو غیرت دینے والی، یوسفِ مصری سے قلمرو حسن میں خراج لینے والی؛ رگِ جاں میں آفت اٹھانے والی، دُنیا سے نرالی خلق میں خلق نہیں ہوئی۔ کبھی آنکھوں نے دیکھی نہ کانوں نے سنی۔ دفعۃً وہ حورِ زاہد فریب، دشمنِ صبر و شکیب، خراماں خراماں باغ کی طرف چلی، چھماں چھماں گلگشت چمن کرنے لگی۔ جلو میں حسینانِ ماہ رو، خوبانِ پری خو؛ کبھی اِس روش پر، کبھی اُس روش پر۔ میں بھی ؎

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

کہتا ہوا افتاں و خیزاں ساتھ چلا، عقل و فہم کو خیرباد کہا۔ میں اس شمع رو کے حسنِ گلو سوز کی لو میں پروانہ ہوا، دنیا و مافیہا کو چھوڑ صید جانانہ ہوا۔ آخر الامر ضبط کی طاقت نہ رہی، منھ سے یہ اشعار بے ساختہ نکل ہی گئے، اور میں نے اس سروِ گلشنِ رعنائی کی طرف مخاطب ہو کر پڑھے:

اے غیرتِ لعبتانِ چینی! | ختم آمدہ بر تو نازنینی
عالم ز رخت بہشت زیب است | اے گل ز کدام گل زمینی
در خورد ہزار آفرین است | چشم تو بجا و آفرینی
یغما گرِ کاروانِ عقلی | برہم زن خانمانِ دینی
در خاتم حلقۂ حسیناں | حسن رُخ تو کند نگینی
من جز تو نہ بینم، و تو از ناز | سوئے من بستلانہ بینی

گلگشتِ نسرین و نسترن اور سیر چمن سے سیر ہو کر، وہ تذرو کو ہسارِ دلربائی قصرِ

بلوریں کی طرف بصد انداز برنائی اور شانِ خود آرائی تشریف فرما ہوئی اور وہاں محفلِ رقص و سرود آراستہ ہوئی کہ دفعتہً گھنگور گھٹا آئی ۔ گھٹا نے جلسے کی کیفیت بڑھائی ۔ ادھر بجلی کی چمک ، رعد کی کڑک ، انہار آبدار سے آبِ رواں کی جھلک ، مرغانِ خوش الحان کی چہک ، سبزۂ نودمیدہ کی لہک ، کرمِ شب تاب کی دمک ، بیر بہوٹی کی دہک ؛ ادھر پا زیبوں کی جھمک ، پیروں کی تھپک ، طبلے کی گمک ، ماہرویوں کی کمر کی لچک ، بھانڈوں کی مٹک ، نقالوں کی تال اور سُم پر دستک ، گھنگھروؤں کی جھنک ؛ قوالوں کی خوش الحانی ، طوائفوں کے گلے نورانی ۔ سبحان اللہ ! یہی معلوم ہوتا تھا کہ راگ اور راگنی دست بستہ سامنے کھڑی ہے[2] ، کوئی برق وش "انا البرق" کہتے ہوئے چمک دمک کر ناچ رہی ہے ۔ کوئی بجلی کی طرح کڑکتی ہے ؎

برق چشمک زن ز طرف کوہساراں می رسد
ساقیا سامانِ ساغر کن کہ باراں می رسد

در و دیوار سے لحنِ داؤدی آشکار ، علمِ موسیقی نمودار ۔ تان سین اگر ایک تان سنتا ، اپنی تان پر لعن طعن کرتا ۔ بیجو باؤلا ہو جاتا ؛ زاہد صد سالہ مسجد اور شوالہ چھوڑ ، زہد و تقویٰ سے منھ موڑ ، رشتۂ زنار و تسبیح توڑ ، دوڑا آتا ، بہشت کی حور اور شرابِ طہور بھول جاتا ۔ مجھے حیرت تھی کہ الٰہی یہ سرود ہے ، گانا ہے ، یا جادو ہے ، سحر ہے ، ٹوٹنا ہے ۔ ایک ایک تان پر وجد کرتا تھا ، احسنت و مرحبا کہتا تھا ۔ غرضکہ ہر سو نغمۂ دلکش کی ندا تھی ، بلکہ طوائفوں کے نورانی گلوں پر خود راگ اور راگنی فدا تھی[3] ۔ اس کے بعد ہر ایک طوائف رخصت ہوئی ، تخلیہ کی صحبت ہوئی ۔ ہاں ، پری رویاں ، مہ پارہ ، غارت گرِ جاں ، دشمنِ دین و

---

۱ اصل : بیٹھی ۔ ۲ "کھڑے ہیں" کی جگہ یہ واحد کا استعمال آئندہ بھی کئی موقعوں پر ہے
۳ "ندا تھے" کی جگہ وہی "تھی" کا استعمال ، واحد بجائے جمع ۔

ایماں کا النبنۃ بجوم، اور اس غنچے میں وہ گلفام نازک اندام کالبدرِ فی النجوم۔
بعدازاں اس طرح مطلع برجستہ دیوان حسن وجمال نے بڑے نازو انداز سے ایک کتاب سراپا انتخاب دست مبارک میں لی اور لحن داؤدی سے پڑھنی شروع کی۔ میں اس کی آواز دلکش سے ایسا مست ہوا کہ عقل سے ہاتھ دھو بیٹھا، فکر و فہم کو رو بیٹھا۔

پنجہ زد عشقش لباسِ پارسائی پارہ شد
طاعت صد سالہ ام تاراج یک نظارہ شد

بے اختیار یہ شعر زبان سے نکلا ۔

غرورِ حسن اجازت مگر نہ داد اے گل
کہ پرسشے بکنی عندلیب شیدا را

یہ سُن کر اس شوخ ستم ایجاد نے[1] مسکرایا اور ایک نگاہ غلط انداز سے میری طرف دیکھا۔ نگاہ میں واللہ اعلم کیا جادو تھا کہ دفعتاً عالم غشی مجھ پر طاری ہوا۔ اس مہ جبیں نے جو مجھے بے ہوش پایا تو پھر نگاہ بھر کے میری طرف دیکھا، اور میں اُٹھ بیٹھا سچ ہے ۔

امیں ہلال مت بھرے سو بیت شیام رتنار
جیت مرت جھک جھک پرت جینہ جیوت اکبار

لیکن میں اس کے حسن برشتہ پر کباب ہوگیا، بے تاب ہوگیا۔ عالم رؤیا میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک پیرمرد ملکوتی صفات، برگزیدہ مخلوقات، ریش سفید یکمشت و دو انگشت، چہرۂ نورانی سے خدا ترسی اور خدا دانی آشکار، عمانِ حق پرستی کا گوہرِ آبدار، میری بالیں پر آیا ہے اور بہ آوازِ بلند کچھ کہہ رہا ہے ۔

لگ گئی آنکھ مری دیکھتا کیا خواب ہیں میں کہ مجسم نظر آئی ہے نوید بہجت

---

[1] "نے" کا یہ استعمال قابل توجہ ہے۔ ویسے قدیم اردو شاعری میں بھی یہ استعمال مل جاتا ہے ع
"قائم نے تیرے ہاتھ سے گھبرا کے رو دیا"

آ کے اس خضرِ[1] مبارک نے کہا بالیں پر   لا تنم قُم کہ یہ غافل نہیں وقتِ غفلت

یہ سنتے ہی معاً آنکھ کھل گئی۔ خواب کی ترکی تمام ہوئی تو نہ وہ دلدار نہ وہ گلزار۔ اس وقت سبزہ زار کے مشاہدے کی ایسی دھن سمائی تھی اور سبزے کی لہک ایسی بھائی تھی کہ میں فوراً ایک باغ میں گیا اور وہاں سے گلگشتِ چمن کرنے لگا۔ درختوں کا نسیمِ سحری سے جھونکے کھانا اور گلوں کا بادِ طرب انگیز کے گدگدانے سے بے ساختہ مسکرانا آنکھوں کو نور بخشتا تھا۔ اور کان کو سرور موفور۔ بادل جھومتے تھے، فرشِ زمردیں کو چومتے تھے۔ بہار کا دربار تھا، سرو چوب دار تھا۔ بریدِ بادِ صبا پیش رو کارواں سبا و تا تار، اور انفاسِ نسیم عطر بیز و عنبر شمیم مثلِ طرّہ تابدار مرغولہ مویانِ فرخار مشکبار۔ اس وقت ایک نورانی صورت نظر آئی اور میری طرف مخاطب ہو کر یہ بات سنائی۔ قولہ:

"جس باغ میں تو گیا تھا اس کا نام فصاحت باغ ہے جو مجالس علم و انشا کا چراغ ہے۔ اور وہ زنِ جمیلہ، فصاحت تھی، اور وہ کتاب مکرمت انتساب، قندیلِ حرم، جس کو خود فصاحت دیکھ کر پھڑک رہی تھی اور مرحبا کہتی تھی"۔

یہ سنتے ہی میں نے گھر کی راہ لی اور قندیلِ حرم کی تلاش کی۔ سبحان اللہ! کیا مکرمت انتساب کتاب ہے۔ حق تو یوں ہے کہ از سرتاپا لاجواب ہے۔ جو فقرہ ہے دل رُبا ہے، جو لفظ ہے شیریں ادا ہے۔ نرگسِ شہلا صاد سے آنکھیں لڑانے کے لیے دیدہ نگراں، میم معشوق غنچہ دہاں۔ الٰہی یہ دندانِ سین ہے یا عقدِ پروین ہے۔ یہ نقطے ہیں یا سیارے ہیں۔ بین السطور ہے یا چشمہ سار۔ الف ہے یا سروِ جویبار۔ ضاد کے نقطے کا یہ حال ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی پری پیکر کی پشت پر خال ہے۔ غرضکہ ابتدا میں انتہائے لطف و سرور ہے، اور انجام میں اول درجے کی کیفیت کا ظہور۔ رباعی:

ل ذوقی نے یہاں "رشکِ مسیحا" لکھا ہے۔

کیا نامۂ نامی ہے مہیائے ظہور

ہے چشمک ہر نقطہ کہ چشم بد دور

اللہ ری کیفیت لفظ و معنی

وہ آنکھ میں ہے نور تو یہ دل میں سرور

نگار بستۂ مضامین دلنشیں، رشک نگار ارمنی؛ اغاید معنی دلکش، غیرت لعبتان چینی۔ سبحان اللہ! گلزار بے خار ہے، گلہائے فصاحت سے آراستہ۔ بارک اللہ! حدیقۂ لطافت بار ہے، انوار بلاغت سے پیراستہ۔ الف کے آگے قامت سرو قداں خجل، قاف کے دو نقطوں سے مہ و مہر منفعل۔ ابروان بتان آذری کو جفتہ طاق ابیات موزوں سے کیا مناسبت اور مہ طلعتان پری پیکر کی جبین شگفتہ کو اس کے بیاض بین السطور سے کیا نسبت۔ سواد رشک لیلۃ البدر، مداد غیرت شب قدر۔ معانی اور لفظ جیسے بو در گل یا کیف در مُل۔ ایجاز مخل سے مبرا؛ زیور لطافت سے متجلّی۔ اطناب، ممل سے معرّیٰ؛ حلیہ براعت سے متحلّی۔ نثر، نثرۂ نثار، شعر، شعریٰ شعار۔ لام سے زلف عطر آگیں کی خوشبو آتی ہے۔ میم شان غنچہ دہاں دکھاتی ہے۔ نون ہلال آسمان یا مہر تاباں۔ اللہ اللہ! کتاب کیا لکھی[1] ہے، بقو لیکہ چمنستان بیان میں رنگ بہار دکھایا ہے، صفحۂ قرطاس کو دامن گلزار بنایا ہے۔ سواد و بیاض جلوۂ شام اودھ و صبح بنارس دکھاتی ہے، ہر سطر سے کہکشاں نظر آتی ہے۔ الفاظ چیدہ و فقرات برجستہ سے جلوۂ معانی یوں عیاں ہے جیسے خدود پری پیکران چگل سے حسن صبح نمایاں۔ نستعلیق گویان عدیم المثال و دقیقہ شناس ایک حرف تک میں حرف گیری نہ کر سکے، اور نکتہ پروران سخن سنج و معنی اساس نے ایک ایک نقطے کی تعریف میں پل باندھ دیئے۔

اب یہ تو بتاؤ کہ اس نادر رو دلربا کتاب کا مصنف باوقار کون صاحب عقل و

---

[1] اصل: لکھی

فرہنگ ہے جس کے خامۂ ندرت ختامہ سے قندیلِ حرم رو کش نگارخانۂ ارژنگ ہے؟ ـــ
عالی جناب، قمر رکاب؛ خاقان خدم، گردوں حشم؛ دارا مرتبت، سکندر صولت؛ مرکز دوائر المناقب والمفاخر، منبعِ انہار المکارم والمآثر؛ رافعِ رایاتِ عظمت، جامعِ آیاتِ جلالت؛ قدوۂ رؤسائے ہندوستان، مفیض البرّ والامتنان؛ خورشید کلاہ ثریا جاہ؛ گوہرِ رخشندۂ درجِ جلال، اخترِ تابندۂ برجِ جمال؛ درۃ التاجِ سلطنت و شہریاری، منطقۃ البروجِ مملکت و جہانداری؛ آرائشِ چار بالشِ حکومت و امارت، زیبائشِ دیہیمِ مکنت و سعادت؛ رئیس ابن رئیس ابن رئیس، امیر کبیر حضور نواب محمد کلب علیخاں بہادر والیٔ ریاست رفیعہ دار السرور رامپور خلد اللہ تعالیٰ ظلال اقبالکم ولازال رفعتکم[له] کی تصنیف لطیف ہے۔ کتاب کیا، چشم بصیرت سے دیکھو تو گل فصاحت و بلاغت کا عطرِ نظیف ہے۔ زہے امیرِ غریب نواز، خہے رئیسِ سراپا اعزاز۔ ریاست کو اس پر ناز، امارت کو اس کی ذات میمنت صفات سے اعزاز۔ گردوں جنابے کہ آفتابِ عالمتاب بر در دولتش از خط شعاعی نیزہ بر دوش؛ رفعت مآبے کہ زہرہ و مشتری در زمرۂ پرستارانش ہمچو کنیزان با ادب حلقہ بگوش۔ قلمرو عدل و نصفت میں کوسِ لمن الملک بجایا اور کشور سخاوت میں پرچم نصرت نصب فرمایا۔ اس کے ابرِ نیساں جود و کرم کے مقابلے میں بحارِ ذخّار بجِ ناپید اکنار قطرے سے کم، اور رائے بیضا ضیا کے مواجہہ میں ذرّہ سے کمتر نیّرِ اعظم، بحرِ قلزم رشک جود کف سے خون درجگر، بحیرۂ اسود روسیاہ و مضطر۔ پیر فلک نے باوصف پیرانہ سالی اس کا عدیل عالم مثال میں نہ پایا۔ گردونِ گرداں نے اس کا سہیم خواب و خیال میں نہ دیکھا۔ خواقین ذوی الاقتدار

له "اقبالکم ولازال رفعتکم" میں "کُم" بمعنی "تم" کا استعمال، "اُن" کی جگہ یہاں ایسا ہی نامناسب ہے جیسے مخاطب کے لئے خطوں میں "سلمہٗ" نام کے بعد لکھا جانا جسکے معنی ہیں "تو" کی ضمیر اسکے لئے آئی ہو۔ محل استعمال "اقبالہم ولازال رفعتہم" کا تھا۔

آستانۂ عرش پایہ پر جبہہ سا، خواقین نامدار خوان نعمت سے زلّہ دربا)، مسبّحانِ ملاء اعلیٰ شکرستان شکر میں مثل طوطیان خوش الحان عذب البیان، انسان ضعیف البنیان اس کج کلاہ کی ثنا میں مانند خامہ بریدہ زبان۔ غربا اور مساکین کو اس قدر لعل و دُرّ ناب بخشے کہ بجز بحر و کان کے کسی نے شکایت کے لئے لب نہ کھولے۔ پھر جو دلہن ایسے بلیغ نکتہ پرور کی مشاطگی سے سنواری جائے وہ اپنے جوبن پر کیوں نہ اترائے۔ اس کا حسن و جمال چشم بد دور، خط و خال نورٌ علیٰ نور۔ اللّٰہ جمیلٌ ویحبُّ الجمال۔

ع خدا بھی خوبصورت کو نہایت دوست رکھتا ہے

پھر آدمی بے چارے کی کیا مجال، انسان ضعیف البنیان کیا ہے۔ ابیات:

حبذا اے والیٔ والا نژاد — فرّخا اے شاعرِ فرخ نہاد
گشتۂ با عندلیباں ہمصفیر — وہ چہ خوش گفتی کلام دلپذیر
حرف حرفش مخزنِ علم و خرد — لفظ لفظش معدنِ علم و خرد
طرز ایجادش گرفتہ مبدم — در جہان وحدت افرازد علم
نثر او بر نثر سعدی خندہ زن — نظم او بر نظم سلماں طعنہ زن
بارک اللّٰہ غنچۂ سر بستہ ایست — نے غلط گفتم عجب گلدستہ ایست

میں نے جب اس اغید زاہد فریب، عدوئے صبر و شکیب؛ مہرِ تابان اوج جلال، ماہ درخشانِ حسن و جمال؛ گوہر ہفت فصاحت سے مزین اور حلی بلاغت سے مشیّن (کو) برافگندہ نقاب وار خود بے حجاب دیکھا تو اس لیلیٰ شیریں ادا کے حسن پر مجنوں کی طرح صحرا صحرا مجنوں اور کوہ کوہ مفتوں ہوا۔

کرنگ سرنگ خامہ ہر چند اس کے مضمار صفت میں دوڑنا چاہتا ہے لیکن کثرت خجلت سے سکندری کھاتا ہے اور عنقائے بلند پرواز فہم و فکر اس کی مدحت کی فضا میں رہ بقفا جاتا ہے۔ یلانِ میدان معانی اور پہلوانانِ ہفتخوانِ منازلِ خوش بیانی

اس کی تعریف کے لئے بیڑا اُٹھا کر آئے مگر یہ بھاری پتھر ان سے نہ اُٹھ سکا۔ آخر کار یا علی کہہ کر چوم کے چھوڑ دیا۔

به طوف کوئے شکر از ناتوانی ہا بہ پا افتم
چو طفل نو قدم برخیزم و دیگر بجا افتم

جس خدا نے خدیو روح کو قلم و جسم میں ممتاز فرمایا، اور پیر خرد کو اس کی وزارت کا عہدۂ جلیلہ عطا کیا، اس گل سرسبد چمن معانی کو دستبرد حاکم خزاں سے محفوظ رکھے اور اس حدیقۂ نظارت افزا کی گلگشت سے دلِ تماشائیاں مثل عنادل محظوظ۔ آمین ثم آمین۔

ختم کرتا ہوں اس دعا پہ کلام — شاعری سے مجھے نہیں سروکار[1]
تم سلامت رہو ہزار برس — ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

---

[1] دیوان غالب میں یہ مصرع اس طرح یوں ہے: شاعری سے نہیں مجھے سروکار